موضوع گفتگو ہے ایودھیا کے مقدمہ کا فیصلہ

جناب شکیل حسن شمسی صاحب ''راشٹریہ سہارا'' دہلی

جناب شکیل حسن شمسی صاحب کا ایک مضمون بابری مسجد سے متعلق الہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ کے فیصلہ سے دو دن قبل روزنامہ راشٹریہ سہارا لکھنؤ میں شائع ہوا تھا اور دوسرا مضمون فیصلہ آنے کے بعد شائع ہوا تھا۔ دونوں مضامین افادیت کے پیش نظر ''شعاع عمل'' میں شائع کئے جارہے ہیں۔ (ادارہ)

(۱) الہ آباد ہائی کورٹ جمعرات کو ساڑھے تین بجے اس مقدمہ کا فیصلہ سنائے گا جس کا یہ ملک گذشتہ ۶۰ برسوں سے منتظر ہے۔ عدالت کیا کہے گی اور کیا فیصلہ ہوگا، اس پر تو کوئی بات کی ہی نہیں جاسکتی، لیکن عوام کی زبردست دلچسپی کے پیش نظر اور معاملے کو تہہ میں جاکر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ایودھیا کی تاریخ پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ جہاں تک ایودھیا کی تاریخ کے نام کا سوال ہے تو یہ سنسکرت اور پالی زبانوں سے ہندی میں آیا ہے۔ ہندوستان کی قدیم زبان سنسکرت میں اس کو ایودھیا کہا گیا، یعنی وہ علاقہ جہاں جنگ کرنے کی ممانعت ہو۔ گوتم بدھ کے زمانے میں اس کو پالی زبان میں ''ایوجھا'' کہا جاتا تھا۔ اس لفظ کا مطلب ناقابل تسخیر ہونا بتایا جاتا ہے۔ اودھ کا مطلب بھی یہی ہے کہ وہ جگہ جہاں کسی کے ودھ یعنی قتل کی اجازت نہ ہو۔ یہ شہر ہندو فرقہ کا چھٹا مقدس شہر ہے اور اس کی اہمیت اس لئے زیادہ ہوگئی ہے کہ یہاں کوشل راج کے ایک بڑے شہنشاہ اور سوریہ ونشی سلسلہ کے ۶۳ ویں حکمراں راجہ دشرتھ کی حکمرانی تھی۔ ان کے گھر میں سب سے پہلے جس بیٹے رام چندر کا جنم ہوا اس کو ہندو فرقہ کے عوام نے اپنے بھگوان وشنو کا اوتار اور اس کو مریادا پرشوتم کے نام سے یاد کیا، یعنی پاکیزہ روایتوں کی پاسداری کرنے والا سب سے اہم مرد کہہ کر مخاطب کیا۔

تاریخی حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایودھیا کو پہلے ساکیت اور شاکی کے نام سے بھی جانا جاتا تھا، لیکن یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ ساکیت یا شاکی کا نام کب بدلا اور کب سے لوگ اس کو ایودھیا کہنے لگے۔ اودھ میں چونکہ 'ی' کو جیم بولتے تھے، اس لئے اس کو اجودھیا کہا جانے لگا، اسی لئے اردو والے بھی اس کو اجودھیا کہنے لگے۔ چھٹی صدی قبل مسیح یہ علاقہ ہندوستان کے ایک اہم ترین مذہب یعنی بدھ ازم کی اہم ترین عبادت گاہوں کے لئے مشہور تھا۔ خود گوتم بدھ کئی بار یہاں آئے تھے، لیکن اب وہاں بدھ مندروں کے نشانات نہیں ہیں۔ غالباً جس زمانے میں ہندوستان میں بدھ ازم کا زوال شروع ہوا، اسی عہد میں مقدس مقامات کو بھی تباہی کا منھ دیکھنا پڑا۔ جین فرقہ کے لئے بھی یہ شہر ایک اہم ترین مقدس مقام ہے۔ یہاں جین فرقہ کے بانی رشبھ دیو کا جنم بھی ہوا تھا۔ اس کے علاوہ وہاں پانچ دوسرے تیرتھانکروں کے پیدا ہونے کے بارے میں بھی روایات موجود ہیں۔ یہاں پیغمبر شیثؑ کی قبر بھی موجود ہے، اس کے علاوہ یہاں سیکڑوں سال پرانی دوسری قبروں کے آثار بھی پائے جاتے ہیں اس لئے ایودھیا کے ساتھ مسلمانوں کا بھی جذباتی لگاؤ رہا ہے۔

ایودھیا شہر کو مرکز بنا کر سب سے قبل سنت والمیکی نے ایک رزمیہ نظم 'رامائن' کے نام سے لکھی۔ ان کے کئی سو سال بعد مشہور کوی

تلسی داس نے رام چرت مانس جیسے شاعرانہ شاہکار کی تخلیق کر کے اس کو ایک بڑے طبقہ کے گھروں کا حصہ بنا دیا۔ کچھ عرصہ بعد تلسی داس کی شاعری کا یہ شاہکار ایک مذہبی صحیفے کی شکل میں تبدیل ہوگیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان میں پوجے جانے والے اوتاروں میں رام چندر جی کو کافی اہمیت حاصل ہے اور ان کے نام سے ایودھیا میں اَن گنت مندر موجود ہیں، جن میں کنک بھون، ہنومان گڑھی، سیتا رسوئی اور دوسرے کئی مندر شامل ہیں۔

جب ہندوستان میں مسلمانوں کو تسلط حاصل ہوا اور وہ مختلف علاقوں میں آباد ہوئے تو ایودھیا میں بھی انھوں نے اپنے گھر بنائے اور عبادت کے لئے مسجدیں تعمیر کیں۔ شہنشاہ بابر کے فوجی جنرل میر باقی تاشقندی نے بھی ایودھیا میں سیتا رسوئی والے مندر کے قریب ایک بلندی پر شاندار مسجد تعمیر کروائی اور اس کا نام بابری مسجد رکھا، لیکن ایودھیا کے عوام اس کو سیتا رسوئی والی مسجد کہا کرتے تھے۔ تاریخ میں کہیں یہ نہیں ملتا کہ لوگ اس جگہ کو رام جنم بھومی بھی کہتے تھے۔ مغلوں کے دور میں ایودھیا کو اودھ کی راجدھانی کا مقام حاصل رہا، لیکن برہان الملک نواب سعادت خان نے سرجوندی کے اس پار اپنا دربار قائم کیا، جس کے بعد وہاں ایک شہر قائم ہوگیا، جس کو فیض آباد کا نام دیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب اودھ کے ہندو اور مسلم مل جل کے رہتے تھے۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ایودھیا میں ۹۶ مندر اور ۳۶ مساجد تھیں، لیکن بابری مسجد یا کسی دوسری مسجد پر کوئی تنازعہ تھا ہی نہیں، لیکن انگریزوں کے قدم پڑتے ہی ہنومان گڑھی کے مندر کے قریب ایک قناتی مسجد کو گرائے جانے کا قضیہ اٹھا اور ۱۸۵۰ء کے ابتدائی برسوں میں تناؤ پیدا ہوگیا۔ اس وقت واجد علی شاہ کی حکومت نے مسلمانوں کی اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا کہ ہنومان گڑھی میں کوئی مسجد تھی بلکہ یہ کہا گیا کہ ایک مسلمان فقیر نے ہنومان گڑھی کے قریب ایک چھپر ڈال دیا تھا، جس میں وہ نماز پڑھا کرتا تھا، اس کو کچھ لوگوں نے تباہ و برباد کر دیا، جس کو مسلمانوں نے مسجد کی شہادت سے تعبیر کیا۔ انگریزوں کی جانب سے اودھ کی حکومت کو نااہل اور ناکارہ ثابت کرنے کی جو کوششیں ہو رہی تھیں، اسی کے تحت ایودھیا کے معاملے کو خوب ہوا دی جا رہی تھی، یہاں تک کہ اودھ میں صدیوں سے امن و آشتی سے رہنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فساد ہوگیا۔ چوں کہ ایودھیا میں مسلمانوں کی تعداد کم تھی، اس لئے اس وقت ان کو کافی جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی جانب سے اس واقعہ کا انتقام لینے کی کوشش کی گئی یہاں تک کہ کئی سو مسلح مسلمان ہنومان گڑھی کی مسجد گرانے کا انتقام لینے کے لئے ایودھیا پہنچ گئے اور بابری مسجد میں قیام پذیر ہوئے۔ ان لوگوں کے آنے کی خبر جب ایودھیا کے سادھو سنتوں اور عام لوگوں تک پہنچی تو لاکھوں لوگوں کی بھیڑ نے بابری مسجد کو گھیر لیا اور وہاں محصور مسلمانوں کو قتل کر کے مسجد میں اپنی فتح کا جشن مناتے ہوئے موہن بھوگ کھایا اور مسجد میں ایک مورتی بھی رکھ دی، بعد میں وہ مورتی وہاں سے ہٹا دی گئی لیکن ہندوؤں نے مسجد کے قریب ایک چبوترہ بنا کر اس پر پوجا پاٹھ کرنا شروع کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد اودھ میں کافی ہنگامہ آرائی ہوئی اور مذہبی منافرت کا طوفان کروٹیں لینے لگا۔ مولوی امیر علی امیٹھوی کی قیادت میں مسلمانوں کا ایک گروہ ایودھیا کے لوگوں سے انتقام لینے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ امیر علی امیٹھوی کے ایک قریبی دوست مرزا جان نے اپنی کتاب حدیقۂ شہداء میں اس واقعہ کا تذکرہ بہت تفصیل سے کیا ہے۔ مرزا جان نے اپنی اسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ مغل شہنشاہ بابر نے ہندوؤں کے ایک دیوتا رام کی جائے پیدائش پر جو مندر بنا تھا، اس کو منہدم کر کے ایک شاندار مسجد تعمیر کی تھی۔ بہر حال ایودھیا کا یہ معاملہ اتنا بگڑا کہ امیر علی امیٹھوی نے ایک فوج لے کر ایودھیا پر چڑھائی کر دی، اس موقع پر انگریز جنرل بارلو کی افواج نے مداخلت کی اور ایودھیا کوچ کرنے والے مسلمانوں کو ردولی کے قریب شکست دی۔ اس معرکہ کے بعد انگریزوں نے امیر علی امیٹھوی کو پھانسی کی سزا دی، جن کو مسلمانوں نے شہید کا خطاب دیا، لیکن اس کے بعد یہ معاملہ ختم ہوگیا اور مسلمان بھول گئے کہ ہنومان گڑھی کے قریب کسی قناتی

مسجد کا کوئی تنازعہ تھا۔ ۱۹۴۹ء میں جب مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد پاکستان کی طرف ہجرت کرگئی تو کسی نے رات کے اندھیرے میں مسجد میں مورتی رکھ دی اور پورے ایودھیا میں مشہور کردیا گیا کہ بھگوان مسجد میں پرکٹ ہوئے ہیں۔ اس کے بعد شہر میں کشیدگی پھیل گئی اور سرکار نے حکم امتناعی نافذ کرکے ہندوؤں اور مسلمانوں کو مذکورہ احاطے میں داخل ہونے سے روک دیا، لیکن ہندو حضرات ایک عقبی دروازے سے اندر داخل ہوتے رہے۔ اس کے کچھ دنوں بعد ایودھیا کے مسلمانوں نے بابری مسجد کی ملکیت کے بارے میں ایک مقدمہ دائر کردیا (جو ابھی بھی چل رہا ہے) اس بیچ ۱۹۸۱ء میں تمل ناڈو کے ایک گاؤں میناکشی پورم میں دس ہزار دلتوں نے اسلام قبول کرلیا اور کئی جگہوں کے دلتوں نے بھی اسی طرح کے ارادے کا اظہار کیا۔ مسلمانوں کا الزام ہے کہ دلتوں کا دھیان اس طرف سے ہٹانے کے لئے وشو ہندو پریشد نے رام مندر کی تعمیر کئے جانے کی ملک گیر تحریک چلا دی اور تبدیلیٔ مذہب کے سلسلے کو روکنے میں کامیابی حاصل کی، پھر اچانک ۱۹۸۹ء میں فیض آباد کی ایک عدالت نے بابری مسجد کا تالا کھولے جانے کی اجازت دے دی، جس کے بعد وہاں باقاعدہ طور پر پوجا پاٹھ شروع ہوگئی، اور آخرکار ۶/دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد شہید کردی گئی اور اس کے ملبہ پر ایک عارضی مندر قائم کردیا گیا۔

اب بابری مسجد کے سلسلے میں مسلمانوں کی آخری امید عدالت کے فیصلے پر قائم ہے، کیوں کہ نہ تو اہل سیاست ان کی مدد کرسکتے ہیں، نہ ہی حکومت سے ان کو کوئی امید ہے کہ وہ اس معاملے میں ان کی مدد کرے گی۔ مسلمان اس بات پر بھی راضی ہیں کہ عدالت جو بھی فیصلہ کرے گی اس کو وہ قبول کرلیں گے لیکن ایک شخص کی طرف سے اس معاملے کو پھر سے ٹالنے کی کوشش کی گئی اور الٰہ آباد ہائی کورٹ میں ہونے والے فیصلے کو موخر کروانے میں اس کو عارضی کامیابی بھی مل گئی۔ فیصلے سے قبل زبردست سیکورٹی انتظامات کی وجہ سے بھی سارے ملک میں ایک عجیب سی سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ فیصلہ موخر ہونے سے تناؤ اور کشیدگی کا ماحول ختم ہوگیا، مگر منگل کو سپریم کورٹ نے الٰہ آباد ہائی کورٹ کے ذریعہ دیئے جانے والے فیصلے پر سے روک ہٹانے کا جو فیصلہ کیا ہے، اس کے بعد ایک بار پھر سارے ملک کی توجہ الٰہ آباد ہائی کورٹ کی طرف مبذول ہوگئی ہے۔ فیصلہ جو بھی آئے، ضرورت اس بات کی ہے کہ فریقین اس کو خندہ پیشانی سے قبول کریں اور کہیں پر قتل وغارت گری کا بازار گرم نہ ہونے پائے۔

(بشکریہ روزنامہ راشٹریہ سہارا (اردو) ۲۹/ستمبر ۲۰۱۰ء)

(۲) بابری مسجد کو شیعہ-سنی تنازع میں بدلنے کی سازش

ہندوستانی مسلمان جب حج بیت اللہ یا عمرہ کے لئے جاتے ہیں تو سب مسجد الحرام اور مسجد نبوی میں باجماعت نماز ادا کرتے ہیں، ایک ساتھ دوسرے ارکان ادا کرتے ہیں۔ لیکن یہ کتنی بدقسمتی کی بات ہے کہ ممبئی اور دہلی میں ہوائی جہاز سے اترتے ہی شیعہ مسجد، سنی مسجد، اہلحدیث کی مسجد یا حنفی مسجد ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ مسلمانوں کے اسی اختلاف کا فائدہ اٹھا کر اسلام دشمن طاقتیں اپنا الو سیدھا کرنا چاہتی ہیں۔ کچھ ایسی ہی کوشش وشو ہندو پریشد کے رہنما اشوک سنگھل کی جانب سے پورے سنگھ پریوار کی ایما پر کی جارہی ہے۔ اشوک سنگھل نے پیر کے روز ممبئی میں اترپردیش کے ایک ہندی اخبار کے ساتھ ایک خاص ملاقات میں کہا کہ چوں کہ بابری مسجد کی ملکیت کے معاملے میں ہائی کورٹ نے سنی وقف بورڈ کا موقف مسترد کردیا ہے، اس لئے اب اگر متنازع جگہ پر کسی مسجد کی تعمیر کی بات ہونا ہے تو وہ شیعوں سے کی جائے۔ اشوک سنگھل نے اس سلسلے میں بہت سے تاریخی حوالے بھی دیئے ہیں اور کہا ہے کہ اس مسجد سے اب سنی مسلمانوں کا کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ اس لئے شیعہ علماء سے بات چیت کی جانی چاہئے۔ انھوں نے اپنے بیان میں یہ بھی بتایا ہے کہ مسجد کی دیکھ بھال کرنے کا خرچ اودھ کی حکومت کی جانب سے دیا جاتا تھا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ویسے تو وہ تمام علاقہ بھگوان رام کی جائے پیدائش

ہے جس کو حکومت نے ایکوائر کیا ہے لیکن اگر کسی وجہ سے ایک تہائی حصہ مسلمانوں کو دینا پڑے تو اس پر بابری مسجد ایکشن کمیٹی یا سنی سنٹرل وقف بورڈ کا کوئی حق نہیں بنتا ہے بلکہ یہ حق شیعوں کو ملنا چاہئے۔ انھوں نے کہا کہ ۱۹۴۹ء میں تنازع پیدا ہونے سے قبل تک مسجد پر شیعوں کا حق تھا۔ اس مقام کا متولی شیعہ مسلمان تھا اور مسجد کے اخراجات پورے کرنے کے لئے اودھ کے نوابوں نے ایودھیا کے قریب واقع صحنواں میں کچھ آراضی بھی وقف کی تھی۔

اشوک سنگھل کا یہ بیان اس وقت آیا ہے جب کہ کئی حلقوں میں آؤٹ آف کورٹ معاملہ طے کرنے کی بات ہورہی ہے۔ ظاہر ہے سنگھ پریوار کی جانب سے لگاتار معاملات کو الجھانے کی کوشش ہورہی ہے، اس لئے انھوں نے ایک نیا شوشہ چھوڑا ہے۔ ویسے یہ کوئی نیا شگوفہ نہیں ہے، بابری مسجد کے انہدام سے بہت قبل اس طرح کی باتیں کی گئی تھیں۔ اس طرح کی باتوں کے پیچھے ذہنیت وہی کارفرما تھی، آج بھی ہے۔ اس وقت بھی شیعہ علماء نے اس کی کھل کر مخالفت کی تھی اور آج بھی ان کی جانب سے اس طرح کی بے بنیاد باتوں کی حمایت نہیں کی جائے گی اس کی پوری توقع ہے۔ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے سابق نائب صدر مولانا کلب عابد مرحوم کی زندگی میں بھی یہ سوال اٹھا تھا لیکن انھوں نے اس کو سرے سے خارج کردیا تھا اور یہی کہا تھا کہ مسجدیں شیعہ یا سنی نہیں ہوتیں وہاں نماز پڑھنے والے شیعہ اور سنی کوئی بھی ہوسکتے ہیں۔ اسی زمانے میں بنارس کے ایک قبرستان کے معاملے میں بھی ایسا ہی مسئلہ اٹھا تھا جب کہ سپریم کورٹ نے ایک فیصلے کے تحت یہ حکم دیا تھا کہ شیعوں کے قبرستان میں دفن دو سنی بزرگوں کی قبریں منتقل کی جائیں۔ کیوں کہ سنی فرقہ کے لوگ اس معاملے میں مقدمہ ہار گئے تھے۔ یہ مرحوم کلب عابد صاحب کی ہی ہمت اور دم خم تھا کہ انھوں نے سپریم کورٹ کے فیصلے کے خلاف فتویٰ دیا اور بنارس کے شیعوں سے کہا وہ وہاں سے قبریں ہٹائے جانے کی ضد نہ کریں کیوں کہ قبرستان شیعہ سنی نہیں ہوتے۔ ان میں دفن ہونے والے شیعہ سنی ہوسکتے ہیں۔ یہ مولانا کلب عابد صاحب مرحوم کی شخصیت کا اثر تھا کہ بنارس کے شیعوں نے مقدمہ جیت لینے کے باوجود وہاں سے قبریں ہٹانے کی ضد نہیں کی اور مسلمانوں کا اتحاد قائم رہا۔ مولانا کلب عابد صاحب اپنی زندگی کے دوران بابری مسجد میں مسلمانوں کو عبادت کا حق دیئے جانے کی پرزور وکالت کرتے رہے اور انھوں نے کبھی یہ بات اٹھنے نہیں دی کہ یہ مسجد شیعوں کی ہے۔ ان کے بعد مولانا کلب جواد صاحب بھی اپنے والد کے نظریات کو آگے بڑھاتے آئے ہیں اور بابری مسجد کی ملکیت کے مقدمہ میں الٰہ آباد ہائی کورٹ کی بنچ کے سامنے انھوں نے یہی کہا تھا کہ مساجد اللہ کی ہوتی ہیں ان کو شیعہ اور سنی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ گو کہ تاریخی حوالوں میں یہ بات ملتی ہے کہ اس مسجد کو تعمیر کروانے والے فوجی جنرل میر باقی تاشقندی عقیدے کے لحاظ سے شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے تھے اور جب مغل شہنشاہ بابر نے ۱۵۲۸ء میں میر باقی کو اودھ کے گورنر کا عہدہ دیا تو انھوں نے اودھ کی راجدھانی ایودھیا میں ایک مسجد تعمیر کروائی، اس کا نام بابر کے نام پر رکھ کر احسان مندی کا ثبوت دیا۔ حالاں کہ اس زمانے میں مسلمانوں میں مسلک اور فرقہ کو لے کر اتنی شدت نہیں پائی جاتی تھی اور ہر کوئی کسی بھی مسجد میں نماز پڑھ سکتا تھا۔ شیعوں کی مسجدیں الگ سے ہونے کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا تھا کیوں کہ جب تک اودھ کی راجدھانی اجودھیا اور فیض آباد رہے اس وقت تک شیعوں کی نماز جمعہ تک الگ سے نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے شیعوں کے لئے الگ سے مسجد ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ شیعوں کے لئے پہلی بار کوئی مسجد اگر الگ سے تیار ہوئی تو وہ نواب آصف الدولہ کے عہد میں ۱۲۰۰ھ میں لکھنؤ میں قائم ہوئی جب نواب آصف الدولہ نے ہندوستان کے پہلے مجتہد العصر مولانا سید دلدار علی غفران مآبؒ کی فرمائش پر ایک عالی شان مسجد اور امام باڑہ تعمیر کروایا۔ مغل شہنشاہوں کے دور میں شیعوں کو کافی مراعات حاصل تھیں، اگر شیعہ اور سنی مسجد کا کوئی تصور اس وقت ہوتا تو جامع مسجد کے آس پاس نہ سہی کہیں دور پر کوئی شیعہ مسجد

ضرور بنی ہوتی۔ اسی طرح دہلی میں مدفون اودھ کے نواب صفدر جنگ کے مقبرے سے ملحق مسجد پر بھی کبھی تنازع نہیں ہوا گوکہ نواب صفدر جنگ عقیدے کے لحاظ سے شیعہ تھے۔ الغرض شمالی ہندوستان کی تاریخ میں کوئی ایسی نظیر نہیں ملتی کہ کوئی مسجد کسی خاص فرقہ کے لئے بنائی گئی ہو۔ البتہ جنوبی ہندوستان میں جو شیعہ ریاستیں تھیں، وہاں صورت حال ذرا مختلف تھی جس کا تذکرہ کرنے کے لئے یہ مضمون کافی نہیں ہوگا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میر باقی خود تو شیعہ تھے، لیکن کیا وہ اپنے ساتھ ایک شیعہ لشکر لے کر آئے تھے؟ اس زمانے میں تو پورے شمالی ہندوستان میں شیعہ یونہی بہت مختصر تھے تو بھلا ان کو ایودھیا میں الگ سے ایک مسجد کی ضرورت کیوں پڑتی؟ اصل میں وہ دور اس قسم کے تعصّبات سے بالکل پاک تھا لیکن بعد میں مسجدیں شیعہ اور سنی بنادی گئیں۔

یہاں یہ بات کہنا بہت ضروری ہے کہ ہندو فرقہ کی جانب سے انیسویں صدی کے ایک مورخ مرزا جان کی ایک کتاب حدیقۂ شہدا کو ایک بنیاد بنا کر کورٹ میں پیش کیا گیا ہے، جس میں انھوں نے بابر کے متعلق بہت لاف وگزاف سے کام لیا ہے۔ مرزا جان بابری مسجد کی تاریخ لکھتے وقت یہ بھول گئے کہ بابر نے جب ہندوستان پر فتح پائی تو اس نے یہاں کے ہندو راجاؤں پر فتح نہیں پائی تھی بلکہ ابراہیم لودھی جیسے مسلمان بادشاہ کو شکست دی تھی۔ مرزا جان نے بڑے فخر سے لکھا ہے کہ عظیم بابر نے جہاں چھوٹا مندر تھا وہاں چھوٹی مسجد بنائی اور جہاں بڑا مندر تھا وہاں بڑی مسجد بنوائی۔ مرزا جان نہ تو خود اس وقت پیدا ہوئے تھے نہ انھوں نے اپنی کتاب میں کسی قسم کا حوالہ دیا ہے کہ انھوں نے یہ بات کہاں سے لی ہے۔ وہ صرف ایک جذباتی مسلمان تھے جو صرف جوش میں لفاظی کر گئے ہیں۔ انھوں نے بابری مسجد کو جنم استھان والی مسجد بھی لکھا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جب بابر نے ہندوستان پر قبضہ کیا اس وقت یہاں پورے طور پر مسلمانوں کی حکمرانی قائم ہو چکی تھی بلکہ تاریخ تو یہ بھی بتاتی ہے کہ ابراہیم لودھی کے خلاف لشکر کشی کرنے والے اس مغل شہنشاہ نے ہندوستان پر جب قبضہ کیا تو مسلمانوں کا ہی خون سب سے زیادہ بہاہا۔ پانی پت کے تاریخی معرکے میں فتحیاب ہونے کے بعد جنگ میں پکڑے گئے تمام قیدیوں کو موت کے گھاٹ اتروا دیا تھا اور یقینی طور پر ابراہیم لودھی کا ساتھ دینے والے سپاہیوں میں اکثریت مسلمانوں کی رہی ہوگی لیکن شروع سے ہی ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ یہ ظلم ہوتا رہا ہے کہ ان کی قربانیوں کو نظرانداز کردیا جاتا ہے۔ بابر کے بارے میں یہ تاثر دیا جاتا رہا ہے کہ جیسے اس کا حملہ ہندوؤں کے خلاف کوئی اسلامی مہم تھی یا جہاد کی کوئی شکل تھی۔ مسلمانوں کو انتہاپسند ہندو اکثر چڑھانے کے لئے بابر کی اولاد بھی کہتے رہے ہیں۔ جب کہ بابر کے ساتھ آنے والے مسلمان بھی مسلمان تھے اور بابر کا مقابلہ کرنے والے بھی مسلمان تھے، لیکن یہ بھی طئے ہے کہ بابر کے ساتھ آنے والے مسلمانوں میں شیعہ بھی تھے اور سنی بھی اور ان کو ایک ہی معبود کے آگے سربسجود ہونے کے لئے الگ الگ مساجد کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ سب سلسلہ بہت بعد میں شروع ہوا ہے، اس لئے بابری مسجد پر شیعہ مسجد کا لیبل لگانا ایک گہری چال کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اس بات کی قوی امید ہے کہ تمام شیعہ علماء سنگھ پریوار کی چال کو ناکام کرنے کے لئے جلد از جلد سامنے آئیں گے۔ (بشکریہ روزنامہ راشٹریہ سہارا (اردو) ۲۶ / اکتوبر ۲۰۱۰ء)

